شرابِ کہن پھر پلا ساقیا (۲)

تحریر: حامد سجاد طاہر*

بیداریٔ یورپ

جہاں اور جس جگہ فلسفہ اور علومِ مادیہ مسلمانوں میں غروب ہوئے تھے وہیں سے وہ یورپ میں طلوع ہوئے۔ دوسری ہزاری کے آغاز میں اندلس کی یونیورسٹیاں مشہور ہو چکی تھیں۔ یقیناً اس وقت عالم اسلام میں دیگر تعلیمی ادارے بھی موجود ہوں گے تاہم ایک تو مکانی اعتبار سے اندلس یورپی اقوام کے لئے قریب ترین تھا دوسرے وہاں پر پائی جانے والی آزاد خیالی بھی باقی خطوں کی نسبت زیادہ تھی جس کی وجہ ان کا علومِ عقلیہ میں سب سے آگے ہونا تھا۔ چنانچہ یورپ کے نوجوانوں نے وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ویسے ہی جانا شروع کر دیا جس طرح آج کل مسلم نوجوان مغرب کا قصد کرتے ہیں۔ تو جس طرح ہمارے نوجوان وہاں سے خیالات مستعار لے کر آتے ہیں بعینہٖ مغربی نوجوان بھی ان افکار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور پھر مسلم سپین میں یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی ایک قابل ذکر تعداد یہودی تھی (جس طرح آج یورپ اور امریکہ میں ہے) لہٰذا انہوں نے آزاد خیالات کو ان کے ذہنوں میں انڈیلا۔ یورپ میں اُس وقت ویسے بھی عوام الناس کلیسا کی چارہ دستیوں سے تنگ آئے ہوئے تھے لہٰذا ان میں آزادی کے ان تصورات کو بہت ہوا ملی اور پھر اندلس ہی کے ایک فلسفی ابن رشد کی تصانیف کا وہاں یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور انہیں مختلف یورپی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کیا گیا اور یورپ از سرِ نو ارسطو اور اس کی منطق سے مستفید ہوا' بلکہ متعارف ہوا۔

ان تمام عوامل نے مل کر کام دکھایا اور سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں بیک

☆ متعلم قرآن کالج لاہور

وقت دو تحاریک نے جنم لیا جن کو ''تحریک احیاء العلوم'' (Renaissance) اور ''اصلاح کلیسا'' (Reformation) کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ (یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ یورپ میں یہ انقلاب کوئی ایک دن یا چند سالوں میں برپا نہیں ہوا' بلکہ اس میں صدیاں لگی ہیں)۔ بہر حال لوتھر نے کئی ایسے پادریوں کے ساتھ مل کر جو خود بھی رومی کلیسا سے وابستہ تھے' رومن کیتھولک چرچ اور اس کے اختیارات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جس کے نتیجے میں پروٹسٹنٹ مذہب وجود میں آیا جس کی بدولت سائنس اور فلسفے کے لئے راہ مزید ہموار ہوئی اور سترھویں صدی عیسوی میں سائنس کا دَور شروع ہوا۔

اس موقع پر رومی کلیسا سے ایک اور غلطی یہ صادر ہوئی کہ اس نے فلسفیانہ افکار کے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار دے دیا جس سے سائنس اور مذہب کے مابین بھی ایک جنگ شروع ہوگئی۔ تاہم اس کے باوجود ابتدائی سائنس دان مثلاً ڈیکارٹ' باؤلے اور نیوٹن وغیرہ مذہب کے مخالف یا کم از کم منکر خدا ہرگز ہرگز نہ تھے' بلکہ باؤلے کے متعلق تو یہ بات مشہور ہے کہ وہ تمام اہم تجربے اتوار کو ہی کیا کرتا تھا۔ نیوٹن تو انتہائی درجے کا مذہبی آدمی تھا۔ وہ بائبل کا بھی گہرا مطالعہ رکھتا تھا اور اس کی مذہبی تحاریر کی تعداد سائنسی تحاریر سے زیادہ ہی ہے۔ تاہم یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مذہب کو جو دھچکے ان سائنس دانوں کی کاوشوں سے لگے دراصل انہوں نے ہی موجودہ مغربی فکر کی بنیاد رکھی۔

اور پھر فلسفہ بھی جس کا کام قرونِ وسطیٰ میں بڑی حد تک مذہب کی چاکری کرنا رہ گیا تھا' اس کے اثرات سے آزاد ہوا اور اپنے فطری حلیف سائنس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو گیا (اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تقریباً تمام ابتدائی اہم فلاسفہ سائنس دان بھی تھے یا اس سے اچھی طرح آگاہ تھے) اور اس کی تشریح و توضیح کا کام سرانجام دینے لگا۔ فکری سطح پر تو انہوں نے کوئی خاص نیا نظریہ پیش نہیں کیا۔ بالفاظِ دیگر فلسفے کی اس پرانی شراب کو سائنس کے نئے جام میں پیش کیا۔ مزید

برآں انہوں نے مذہب کا ہی نہیں تقریباً ہر اُس فلسفے کا بھی ابطال کیا جو کسی بھی شکل میں مذہب کا مدد و معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل میں ہیوم نے لاادریت کا پرچار کیا اور عقلی دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ عقلِ انسانی خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔ اسی بات کو کانٹ نے اپنی مشہورِ عالم کتاب ''تنقیدِ عقلِ خالص'' میں انتہا تک پہنچا دیا۔ ڈارون نے نظریہ ارتقاء پیش کر کے گویا مذہب کے آخری قلعہ کو بھی مسمار کر ڈالا جس کا نتیجہ کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت اور فلسفۂ اشتراکیت کی صورت میں نکلا۔ فرائڈ نے تمام مذہبوں کو انسانی خوف کا مظہر قرار دیا۔ منطقی اثباتیت نے مابعد الطبیعیاتی تصورات کو لغو اور مہمل قرار دے کر انہیں اپنی بحثوں سے باہر نکال دیا اور بالآخر نطشے نے ببانگ دہل اعلان کیا ''خدا مر چکا ہے' اب ہر کوئی اپنے عمل میں آزاد ہے''۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)

المختصر یہ کہ یورپ میں اڑھائی تین سو برس قبل جو خیالات پیدا ہونے شروع ہوئے تھے اور جو بھی مکاتب فکر وجود میں آئے تھے ان سب میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ ماورائی یا خیالاتی تصورات کی جگہ مادّی حقائق کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ لہٰذا خالص علمی سطح پر تو سائنس نے بھی اور منطقی اثباتیوں نے بھی کھلے عام خدا کا انکار نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ ''اگر کوئی شے واقعتاً ہمارے حواس کے دائرے کے باہر موجود ہے تو ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض کر بھی لیں تو اسے دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے' اس لئے ایسی کسی بھی شے کا علم حاصل کرنے کی ہر کوشش سعی لا حاصل ہے''۔ لہٰذا انہوں نے اسے اپنے دائرۂ کار سے نکال دیا اور توجہات دوسری جانب مرتکز کر لیں۔ اس ردِّ عمل کی بنا پر یہ خیالات دماغوں سے نکلتے چلے گئے یا کم از کم غور و فکر کا مرکز نہ رہے جس سے تمام توجہات خدا سے ہٹ کر کائنات' روح سے ہٹ کر جسم اور حیاتِ اُخروی سے ہٹ کر حیاتِ دُنیوی پر مبذول ہو گئیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہم ڈیکارٹ کی درج ذیل مثال کا سہارا لیتے ہیں:

''تمام فلسفے کی مثال ایک درخت کی سی ہے جس کی جڑیں مابعد الطبیعیات

تصورات ہیں' تا طبیعیات ہے اور تنے سے نکلنے والی تمام شاخیں تمام دیگر مادی علوم ہیں جن کو تین بنیادی علوم میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی طب (Medicine)' میکینکس (Mechanics) اور اخلاقیات (Morals)۔ اخلاقیات سے میری (یعنی ڈیکارٹ کی) مراد وہ اعلیٰ ترین اور اکمل ترین اخلاقی نظام ہے جو کہ تمام دیگر سائنسی علوم کی بنیادوں پر کھڑا ہوا اور یہ حکمت کا بلند ترین درجہ ہے۔ اب یہ درخت کی جڑیں یا تنا نہیں ہے جہاں سے کوئی پھل پائے گا' بلکہ یہ تو شاخوں کے سرے ہیں (جہاں سے پھلوں کا حصول ممکن ہے) چنانچہ فلسفے کا اصولی فائدہ ان حصوں سے حاصل ہوتا ہے جنہیں سب سے آخر میں سیکھا جاتا ہے''۔

اب ہم اس اقتباس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مابعد الطبیعی تصورات کا انکار اس نے بھی نہیں کیا' تاہم اس نے ان خطوط کی طرف نشاندہی کی ہے جن سے توجہ کا اصل مرکز تین دیگر علوم بن جاتے ہیں' یعنی:

۱) میکینکس' جس کا تعلق کائنات کے ساتھ ہے۔

۲) طب' جس کا تعلق انسانی جسم کے ساتھ ہے' اور

۳) اخلاقیات کا صرف وہ حصہ جس کا تعلق حیاتِ دُنیوی کے ساتھ ہے۔

اور دراصل یہی وہ تین بنیادی نکات ہیں جن پر جدید مغربی فکر کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اب اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ خدا ہی اصل حقیقت ہے اور کائنات کی حقیقت اس کے سامنے ایک ادنیٰ مخلوق سے زائد نہیں ہے اور پھر روح ہی حیاتِ انسانی کی اصل حقیقت ہے اور انسان کی عظمت اور مسجودِ ملائک ہونے کی اصل بنیاد ہے' ورنہ بدن کے لحاظ سے تو انسان بس ایک نسبتاً بہتر حیوان سے زائد نہیں ہے اور پھر حیاتِ اُخروی ہی اصل اور باقی رہنے والی زندگی ہے اور اس کے مقابلے میں حیاتِ دُنیوی کی حیثیت محض ایک کمرۂ امتحان سے زائد نہیں ہے' جس کے تمام مال و متاع کی وقعت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک پرکاہ سے زائد تو کیا اتنی بھی نہیں ہے۔ لیکن ﴿اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی﴾ کے مصداق انسان اپنی صلاحیت کار کو جس کام میں بھی استعمال کرے گا اپنے نصیب

کے مطابق پھل پائے گا۔ وہ گمراہی کے لئے کوشش کرے گا تو اللہ اس کے لئے گمراہی کی راہ کو آسان کر دے گا' وہ ہدایت کے لئے کوشاں رہے گا تو اللہ اس کے لئے ہدایت کی راہ کھول دے گا۔ ان شاء اللہ' یعنی اگر اس نے چاہا۔ اسی لئے اگرچہ خدا کے مقابلے میں کائنات' آخرت کے مقابلے میں دنیا اور من کے مقابلے میں تن کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے' لیکن جس طرح ایک ذرّے کی حیثیت یوں تو سورج کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن جب اس ذرّے کو پھاڑا گیا تو اس میں سے ایک اور سورج برآمد ہو گیا ع

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!

بعینہٖ اسی طرح جب تمام توجہات کا مرکز یہی تین چیزیں بن کر رہ گئیں تو ایسے ایسے انکشافات سامنے آئے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں اور اس سب کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ ان مسلسل ہونے والی ایجادات اور دریافت کی قوت سے لیس ہو کر یورپ باقی دنیا کے لئے ناقابل تسخیر بنتا چلا گیا تو دوسری طرف سائنسی میدانوں میں ہونے والی یہ ترقی بذاتِ خود اس بات کی دلیل بنتی چلی گئی کہ اصل قابل توجہ شے دراصل مادّہ اور اس کے قوانین ہیں نہ کہ خدا' اور جسم اور اس کی حقیقت ہے نہ کہ روح اور اس کی غذا' اور دنیا اور اس کی آسائشیں ہیں نہ کہ آخرت۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اگر کسی حلقے سے ان تین چیزوں کی جانب توجہ دلانے کی صدا بلند ہوتی ہے تو اس کا مسکت جواب یہی دیا جاتا ہے کہ اس طرح تو ہم دنیا میں پیچھے رہ جائیں گے یا سائنس کے میدان میں دنیا کا مقابلہ نہ کر سکیں گے ع

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی!

یورپ کا عالم اسلام پر دھاوا اور اس کا ردّعمل

اب انہی مادی قوتوں اور طاقتوں سے لیس ہو کر جب یورپ نے مشرق کا رُخ کیا تو کوئی دیوار اس کی راہ میں سدّ سکندری ثابت نہ ہو سکی۔ صرف سلطنت عثمانیہ ان کی راہ میں ایک رکاوٹ تھی مگر اس کا حل واسکوڈے گاما نے ایک متبادل راستہ تلاش کر کے

نکال لیا اور یورپی ممالک نے تقریباً بقیہ تمام عالم اسلام پر قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد انہی میں سے کرائے کی فوجوں کے ذریعے آخر میں خلافت عثمانیہ کا کانٹا بھی نکال کر باہر پھینک دیا گیا۔

یورپی اقوام کا یہ غلبہ اولاً تو عسکری ہی تھا لہٰذا اس کا اوّلین ردّعمل بھی عسکری ہی نکلا اور مختلف جگہوں پر آزادی کی جنگیں لڑی گئیں۔ مثال کے طور پر برعظیم کے مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی۔ اسی طرح مختلف قائدین نے جنم لیا جن کے پیش نظر اوّلین مقصد آزادی ہی تھا۔ چنانچہ مہدی سوڈانی ہو یا کوئی اور، سب کا اصل مقصد تو یہی تھا، ہاں ساتھ ہی عوام کے جوش و جذبے کو ابھارنے کے لئے کچھ ذیلی اور ضمنی قسم کے نعرے بھی لگوائے گئے۔ شاعر ہو یا خطیب سب نے ہی مسلمانوں کو وہی پرانا عسکری غلبہ یاد دلایا اور انہیں اس کے لئے ابھارنے کی کوشش کی، چنانچہ کہیں مسدّس پڑھی گئی تو کہیں شاہنامے کو سنا گیا۔

سیاسی غلبے کے ساتھ ساتھ یورپی اقوام نے عالم اسلام میں اپنے افکار و نظریات کی تبلیغ بھی شروع کی۔ اکثریت تو پہلے ہی یورپ کی مادی ترقی سے متاثر تھی اور اسے انگریز کی ہر ادا میں حسن نظر آ رہا تھا۔ اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر زندہ قوم کم از کم بنیادی انسانی اوصاف سے مزیّن ہوتی ہے۔ جیسے نظم و ضبط، وقت کی پابندی اور صفائی وغیرہ۔ لہٰذا محکوم قوم اس سے بھی مرعوب ہوئی اور اس کے ہر اُس طبقے نے جو اِس بات کی ہمت و صلاحیت رکھتا تھا، یورپ کی اندھی تقلید شروع کر دی۔ خالص فلسفے اور عمرانیات کے معاملے میں چونکہ یورپ میں بھی باہم اختلاف پایا جاتا تھا چنانچہ یہاں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ ترجیح و انتخاب کا معاملہ ہو گیا اور یار لوگوں نے بزعم خود اسلام سے قریب ترین چیزیں چننے کا کام کیا، لیکن سائنس اور اس کے اکتشافات چونکہ حتمی اور قطعی تھے لہٰذا اسے وحی کی طرح من و عن قبول کر لیا گیا۔ اور اسی کے ساتھ وہی ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر تمام عالم اسلام کے کچھ نہ کچھ سوچنے والے عناصر کے اندر حلول کر گیا اور یورپ کی طرح یہاں بھی ایمان بالغیب کی جگہ ایمان بالحواس رائج ہو گیا اور

ہر مکتبِ فکر میں خدا کی جگہ کائنات' رُوح کی جگہ مادّہ اور حیاتِ اُخروی کی جگہ حیاتِ دُنیوی کی اہمیت مسلم ہوتی چلی گئی' یہاں تک کہ اس طوفانِ الحاد سے دینی و مذہبی ذہن رکھنے والے افراد بھی بچ نہ سکے۔

تھا جو ناخوب' بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

———☆———

اب ہم اپنی توجہات کا مرکز برصغیر یا جنوبی ایشیا کو ٹھہراتے ہیں اور ان کاوشوں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں جو اِس یورپی فکر کے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کے سلسلے میں کی گئیں۔ ۱۸۵۷ء تک کی تقریباً تمام تحریکوں کے پیشِ نظر تو انگریزوں کو ہند سے نکال باہر پھینکنا اور پھر سے مسلم حکومت کا قیام تھا' لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے مسلمانوں کے قائدین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب انگریزوں کو عسکری قوت کے بل بوتے پر یہاں سے نکالنا ممکن نہیں رہا' اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس کے بل بوتے پر وہ ہند میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں اور تلوار کی جگہ قلم کی طاقت کو استعمال میں لایا جائے۔ تاریخ مسلمانانِ ہند کے اس نازک موڑ پر دو شخصیات اٹھ کھڑی ہوئیں' یہ دونوں شخصیات ایک ہی استاد کی شاگرد تھیں' تاہم اس انتہائی اہم مرحلے پر دونوں نے اس امر پر تو اتفاق کیا کہ مسلمانوں کو ایک علاج کی ضرورت ہے' تاہم وہ علاج کیا ہو' اس ضمن میں اختلافات نے دونوں شخصیات کو الگ الگ تعلیمی ادارے قائم کرنے پر مجبور کیا جنہوں نے دو متضاد تحاریک کی شکل اختیار کر ڈالی اور تاریخ ہند پر گہرے اثرات چھوڑے۔

(۱) علی گڑھ:

۱۸۷۷ء میں (یہاں یہ بات واضح رہے کہ علی گڑھ سکول ۱۸۷۵ء میں بن چکا تھا تاہم کالج ۱۸۷۷ء میں بنا) علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے اُس وقت کے وائسرائے لارڈ لٹن نے اسے مسلم ہندوستان میں معاشرتی تغیر کا آغاز قرار دیا تھا اور یہ

پیشین گوئی مستقبل میں حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ سرسید نے جب اس کالج کا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کیا تو ان کے پیش نظر تین اہم مقاصد تھے:

۱) زمانے کا ساتھ دیا جائے۔

۲) اسلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

۳) ہم بھی یورپ کی طرح راہِ ترقی پر گامزن ہوں۔

لہٰذا انہوں نے جو تصور اس ادارے کا بنایا اس کے مطابق اس میں ایک انگلش کالج، ایک عربیک کالج اور ایک اردو کالج ہونے تھے۔ تاہم چونکہ ادارے کا انحصار بڑی حد تک سرکاری گرانٹ پر تھا لہٰذا باقی دو کالجز کی بساط لپیٹ کر صرف انگلش کالج کا قیام عمل میں لایا گیا اور تالیف قلب کے واسطے سو نمبر کی اسلامیات کو شامل نصاب کیا گیا جس کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی اور نتیجتاً علی گڑھ اس کہاوت کا کہ ''حاکم قوم کی تہذیب ہی محکوم قوم کا مذہب ہوتی ہے'' عملی نمونہ بن کر رہ گیا اور مذہب کے ایک لادینی ایڈیشن کو مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ انداز میں پیش کر دیا گیا جس سے دین و مذہب کی تو جان نکل گئی تاہم اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت درپیش نہ ہوئی۔

سرسید اور ان کے شاگردوں نے علی گڑھ کے ذریعے جس مکتب فکر کی بنیاد رکھی اس کا اصل الاصول عقل کی نقل پر حکمرانی تھی۔ انہوں نے نقل کے معاملے میں ہر اُس میدان سے پسپائی اختیار کی جہاں نقل کو عقل پر نبرد آزما پایا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ سرسید آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے آیاتِ آفاقیہ کا مطالعہ کرتے، مگر انہوں نے سائنس کی روشنی میں قرآن اور اسلام کا مطالعہ بلکہ کانٹ چھانٹ شروع کر دی اور کھلی گمراہی کا شکار ہو گئے۔ اس مکتب فکر کے نمائندوں میں سرسید احمد خان، پروفیسر فضل الرحمٰن، غلام احمد پرویز اور جسٹس امیر علی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ذیل میں اس تحریک کے دس اہم نظریات بیان کئے جا رہے ہیں:

۱) دُنیوی یا مادی کامیابی ہی نظریات و افکار کی صحت کا اصل معیار ہے۔

۲) ہمارا علاج صرف اور صرف یورپ ہی کی طرح سائنسی ترقی کرنے میں ہے۔

۳) یہ دنیا خدا کی محتاج نہیں (معاذ اللہ)
۴) فرشتوں سے قرآن کی مراد قوانین فطرت ہیں۔
۵) لہٰذا حضرت جبرئیلؑ کوئی شخص یا ہستی نہیں ہیں اور قرآن حضور اکرم ﷺ کے دل پر نازل کیا گیا جسے بعد میں آپ نے الفاظ کا پیرایہ پہنایا۔
۶) مشتعل مزاج اور اجڈ افراد کو قرآن نے جنات سے تعبیر کیا ہے۔
۷) جنت و دوزخ حقیقی جگہیں نہیں' بلکہ صرف ذہنی کیفیات کا نام ہے۔
۸) جہاد کا اصل اور واحد مقصد دفاع ہے۔
۹) تمام معجزات دراصل سائنسی اتفاقات تھے۔
۱۰) اسلام میں رواداری کا غلط تصور پیش کیا گیا۔

۲) دیوبند

دیوبند دراصل مصالحت کی جگہ مدافعت کا نام تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں یہ گویا سنتِ اصحابِ کہف کا اتباع تھا' یعنی جس طرح اصحابِ کہف نے مقابلے کی سکت نہ رکھ سکنے کے باعث ایک غار میں پناہ لے لی تھی' یہ بھی اپنے مکتبوں' مدرسوں اور مسجدوں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہر طعنے کو سہا مگر اپنی روش نہ چھوڑی۔ انتہائی مسدود حالات میں بھی اپنی انا کو طاق میں رکھ کر مسلمانوں سے ہی مدد چاہی مگر سرکاری مدد کی طلب نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ادارہ مغربی استعمار اور فکر کے خلاف ایک بغاوت کی علامت بن کر رہ گیا اور مؤمن کے توکل علی اللہ کے جذبے کی عملی شکل بن گیا۔

اس دار العلوم کا آغاز ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی قیادت میں سہارن پور (یو۔پی' بھارت) کے ایک قصبے دیوبند کی مسجد چھتہ میں ہوا۔ اس کے اوّلین شاگرد مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے جو بعد میں شیخ الہندؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس تحریک کو پانچ نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:
۱) افکار و نظریات کی صحت کا اصل معیار قرآن اور اقوالِ شارحِ قرآن ہیں۔

۲) عقل کا استعمال صرف قرآن وحدیث کے معروضی مطالعے کے لئے کیا جائے۔
۳) عقائد اور فقہ حنفی کو بلا چون وچرا مانا جائے۔
۴) آٹھ سو سال پرانے فلسفے اور منطق کو تو نصاب میں جگہ دی گئی مگر جدید رجحانات کی جانب کوئی توجہ نہ دی گئی۔
۶) اور عملاً جدید علوم مثلاً سائنس اور فلسفۂ جدید سے بیزاری کا اظہار کیا گیا۔

چنانچہ یہ تحریک مغربی سیلاب کے سامنے بند تو نہ باندھ سکی البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس کی بدولت ایک طبقے کی ایمان کی دولت محفوظ رہ گئی' مادہ پرستی کے اس دورِ ظلمت میں کہیں کہیں روحانیت کی شمعیں بھی جلی رہ گئیں اور قرآن وحدیث کے علوم کے تحفظ کی بنا پر دین وشریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا۔ تاہم اسلام وایمان کے تحفظ کے باوجود عقل کو سرے سے ہی قابل اعتناء نہ جاننے کے باعث یہ ادارہ جمود کا شکار ہو گیا۔ علی گڑھ تقلید یورپ کا داعی تھا تو یہ تقلیدِ اسلاف کی مثال بن کر رہ گیا۔ لیکن اس سب کے باوجود دیوبند لاکھ کم نظر سہی مگر اسلام کا قلعہ بننا اسی کی قسمت میں لکھا تھا۔

ان دو متضاد اداروں نے دو متضاد تحاریک کو جنم دیا۔ علی گڑھ کی مثال پر لاتعداد سکول اور کالج ہندوستان کے طول وعرض میں قائم ہوئے تو دیوبند کو نمونہ بنا کر بے شمار مدارس بھی خیبر سے ڈھاکہ تک وجود میں آئے' جنہوں نے قوم کو دو متضاد طبقوں میں تقسیم کر دیا اور مسٹر اور ملاّ کی باہم کشاکش جاری ہو گئی۔ (جاری ہے)

ہفت روزہ ''ندائے خلافت'' لاہور کا

عراق نمبر

شائع ہو گیا ہے' جس میں اسلام سے قبل عراق کی پانچ ہزار سالہ تاریخ' خلافت عباسیہ اور خلافت عثمانیہ میں عراق کا عروج' مغربی استعمار اور امریکہ کی ریشہ دوانیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ خوبصورت سرورق اور مستند ومعتبر اعداد وشمار ''عراق نمبر'' کو ایک مستقل حوالہ جاتی کتاب بناتے ہیں۔ قیمت: 20 روپے